محمد ابرار ارشد

استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ

ظفر علی خان کے اخبارات ورسائل: تحقیقی مطالعہ

Zafar Ali Khan's Newspapers and Magazines

Maulana Zafar Ali Khan is one of the most respected names in Urdu literature and Urdu journalism. He exposed Urdu journalism to new heights.Zafar Ali Khan's literary career began in Hyderabad during the Deccan era. His first journal “Afsana" was the publication of a fictionalized translation of Western fiction. Zafar Ali Khan released another magazine "Deccan review” for his scholarly writings Zafar Ali Khan takes over as editor of his newspaper "Zamindar" after the death of his father Maulvi Sirajuddin Ahmed. The “Zmeendar" who was just the voice of the landlords has now become the voice of the whole Indian and Urdu class. Maulana Zafar Ali Khan released another magazine, "Punjab Review" which could not continue for long. Zafar Ali Khan released a scholarly and literary magazine when the English government of India banned the “Zameendar".

Keywords: *Newspapers, magazine, literature, Fiction, journalism, short story, politics, poetry, novel, criticism, auditorial, publishing*.

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد برصغیر میں مسلم قیادت کا شدید بحران پیدا ہوا کیونکہ اکثر و بیشتر رہنما و علما کو پھانسی دے دی گئی یا پھر جبری جلاوطنی اور ہجرت پر مجبور کر دیا گیا؛ ایسے میں سرسید خان جیسے مصلحِ قوم کا مسلمانوں کی باگ ڈور سنبھالنا نہایت فائدہ مند ثابت ہوا۔ بدلے حالات میں مسلمان سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور ادبی حوالے سے نہایت بدحالی کا شکار تھے۔ انگریز مسلمانوں کو اپنا ازلی دشمن سمجھ رہا تھا اور انگریز طبقے میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا ہے، وہ اقتدار چاہے کیسا کمزور اور شکستہ ہی کیوں نہ تھا، مسلمان اپنے اقتدار کو واپس حاصل کرنے کے لیے لازمی جدوجہد کریں گے۔ انگریز یہ بھی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں جب تک جذبہ جہاد باقی ہے وہ اپنی نشاۃ الثانیہ اور احیائے ملت کے لیے لازمی کوشاں رہیں گے؛ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو محروم طبقہ بنانے اور سیاسی و معاشرتی سطح پر دبانے کی بھرپور کوشش کیں۔ اس بات کی تائید ۱۸۵۷ء کے دوران میں لاہور کے ایک اینگلو انڈین انگریزی اخبار ”لاہور کرانیکل“ کے اداریے اور تبصرے کرتے ہیں۔ ۱۱ نومبر ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں یہ اخبار لکھتا ہے:

"مسلمان کی فطرت میں باغیانہ جذبہ موجود ہے۔ یہ اُس کے مذہب نے پیدا کر رکھا ہے۔ جب تک ہماری حکومت مسلمانوں کا مذہب برداشت کرے گی اس وقت تک دشمنی کا جذبہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ روز بروز بڑھے گا۔"(۱)

اسی اخبار میں ایک نامہ نگار لکھتا ہے:

"اب اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس بغاوت کی تہ میں مسلمانوں کی سازش کار فرما ہے۔ انھیں شدید سے شدید سزا دینی چاہیے کیونکہ یہ جب تک مسلمان ہیں اپنی رائے کو نہ بدل سکتے ہیں نہ بدلیں گے۔"(۲)

انگریزوں نے کینہ پروری اور انتقامی کارروائیوں سے مسلمانوں کو کمزور کرنے اور معاشی طور پر مفلوک الحال کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ مسلمان بھی انگریز کی نفرت میں جدید علوم و فنون سے بے زار ہوتے چلے گئے۔ ان حالات میں مسلمانوں میں سرسید احمد خان جیسا ہمدردِ قوم پیدا ہوا جس کو مسلمان قوم کی ابتری، بدحالی، محرومی اور پریشانی کا صحیح ادراک تھا۔ سرسید کا خیال تھا کہ مسلمان جب تک جدید علوم سے آراستہ نہیں ہوں گے اور علوم و فنون کے ساتھ ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی، فلسفہ، منطق وغیرہ میں دَرک حاصل نہیں کریں گے تب تک وہ اپنی حالت کو درست نہیں کر سکیں گے۔ سرسید واحد فرد تھے جن کو انگریزوں کا اعتماد بھی حاصل تھا اور وہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان دوریاں ختم کرنے اور ان کو قریب لانے کے لیے بھی کوشاں تھے۔ "رسالہ بغاوتِ ہند" اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس میں سرسید نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا مدلل اور منطقی تجزیہ کیا۔ سرسید نے مسلمان قوم کا مقدمہ ایک منجھے ہوئے وکیل کی طرح لڑا اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اصلاح اور بہتری کے لیے بہت سے عملی اقدامات بھی کیے۔ سرسید نے جو ہمہ وقت خدمتِ قوم کی وہ شاید اور کوئی فرد نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے ہر محاذ پر چاہے وہ سیاسی ہو، مذہبی ہو یا ادبی قوم کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں اور قوم کے لوگوں نے کے لیے نئے راستے متعین کیے جن پر گامزن ہو کر وہ عظمتِ رفتہ کا سراغ پا سکتے تھے۔ سرسید نے جو ادارے قائم کیے ان سے قوم کو پسماندگی دور کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام ہے؛ ان کے اس ادارے کی علمی و ادبی فضا میں تربیت پا کر بہت سے ایسے درخشندہ ستارے آسمانِ ہند پر طلوع ہوئے جن کی تابناکی اور روشنی سے اس قوم کے نصیب کی تاریکی دور ہوئی۔

ظفر علی خان بھی علی گڑھ کے تربیت یافتہ تھے ان کی علمی و ادبی تربیت اُسی خاص ماحول میں ہوئی تھی۔ انھوں نے شبلی نعمانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے تھے؛ پروفیسر آرنلڈ سے فیض حاصل کیا تھا؛ حالیؔ اور محسن الملک کی آنکھیں دیکھی تھیں؛ سرسید کی قوم کے لیے تڑپ محسوس کی تھی؛ محمد علی، شوکت علی، میر محفوظ علی بدایونی، مولوی عبدالحق، عزیز مرزا جیسوں کی رفاقت میں دن گزارے تھے۔ وہ جدید علوم و فنون کی افادیت سے آگاہ تھے اور قوم کی ان سے دوری سے بھی واقف تھے۔ ظفر علی انگریزی زبان کی اہمیت کو بھی جانتے تھے اور خود بھی انگریزی میں مہارت رکھتے تھے؛ علی گڑھ کی علمی و ادبی سوسائٹیوں کا حصہ تھے؛ شاعری کرتے تھے اور علی گڑھ میں ہونے والے مختلف علوم کے مذاکروں میں شرکت کرتے تھے۔ الغرض اس پرزور اور توانا شخصیت کے ابتدائی خدوخال علی گڑھ ہی میں ترتیب پائے جس نے بعد میں انگریزی استعمار کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس زمانے میں جب مسلمان ابھی اس شعوری سطح پر نہیں پہنچے تھے کہ اپنی کامل آزادی اور انفرادی حیثیت کے حصول کے لیے انگریز سے برسرپیکار ہوں؛ وہ ابھی متحدہ ہندوستان میں انگریز ہی کے زیرِ سایہ اپنے مقامی حقوق اور عالمی سطح پر مسلمان ملت کے حقوق کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے؛ ایسے میں ظفر علی خان نے مسلمان کو باشعور اور باصلاحیت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنی صحافتی تحریروں سے جو گراں قدر خدمات پیش کیں ان کا جائزہ آئندہ صفحات میں لیا جائے گا۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ظفر علی خان کو نواب محسن الملک کی رفاقت نصیب ہوئی جس سے ان کی سیاسی، صحافتی اور ادبی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہوا۔

> "نواب محسن الملک ان دنوں حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بمبئی میں قیام پذیر تھے۔ خواجہ غلام الثقلین کے مستعفی ہونے کے بعد نواب صاحب کو ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ مولانا شبلی نعمانی کی وساطت سے ظفر علی خان کا تقرر اس جگہ ہوا، اور وہ نواب صاحب کی انگریزی خط کتابت کا جواب دینے کے علاوہ ان کے ایماوارشاد پر فلسفے کے مضامین اور کتب وغیرہ کا اردو ترجمہ کرتے تھے۔"[۳]

ظفر علی خان نے تقریباً ایک سال کا عرصہ نواب کی صحبت میں گزارا، بعد ازاں حیدر آباد کے علمی و ادبی ماحول کا چرچا سن کر وہاں قسمت آزمائی کی ٹھانی۔ وہ ایک نئے ماحول اور فضا کے متلاشی تھے اور حیدر آباد دکن کا ماحول زوال دِلی و لکھنو کے بعد ہندوستان بھر میں سے واحد و یکتا ماحول تھا جہاں صاحبانِ علم و فن کی قدر افزائی کی جاتی تھی۔ پورے ہندوستان کے ماہرینِ علم و فن، ادیب وغیرہ حیدر آباد دکن میں رونق افروز تھے، سو ظفر علی خان بھی یہاں

چلے آئے اور نواب محسن الملک کی سفارش اور شبلی نعمانی کے مشورے سے حیدر آباد فوج میں ملازم ہو گئے۔ فوج میں بھی جوہرِ قابل دکھائے۔ نیزہ بازی، شہ سواری، پیراکی میں ماہر تھے اور ورزش کے حد درجہ شوقین نیز کھیل کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ابھی زیادہ دن یہاں نہ گزرے تھے کہ علی گڑھ کے سینئر ساتھی مولوی عزیز مرزا کے ایما پر ہوم آفس چلے آئے۔ مولوی عزیز مرزا ان دنوں حیدر آباد دکن میں ہوم سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ ظفر علی خان نے پوری مہارت اور تن دہی سے کام لیا اور جلد ہی مترجم سے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے پر ترقی پا گئے۔ حیدر آباد دکن میں ظفر علی خان کی تمام تر علمی و ادبی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں اور وہ مختلف علمی و ادبی مشاغل میں حصہ لیتے رہے۔ تصنیف و تالیف اور تراجم کا ایک وقیع سلسلہ شروع ہوا۔ بطورِ صحافی ان کی شخصیت کے ابتدائی خد و خال بھی حیدر آباد دکن ہی میں ترتیب پائے اور یہاں ہی انھوں نے مختلف رسائل و جرائد کے اجرا کا سلسلہ قائم کیا۔ ظفر علی خان کی صحافتی نثر کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ ان رسائل و جرائد پر ایک نگاہ ڈالی جائے جو مختلف ادوار میں ظفر علی خان نے جاری کیے؛ ان رسائل و جرائد کا عہد، ان کے اجرا کے اسباب اور ان کے رجحانات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے، تا کہ ان کے تناظر میں مولانا ظفر علی خان کی صحافتی نثر کی درست تفہیم کی جا سکے۔

افسانہ:

"افسانہ" مولانا ظفر علی خان کا جاری کردہ پہلا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ ماہوار تھا۔ اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے بقول یہ رسالہ ۱۹۰۲ء کے اواخر میں جاری ہوا[۴] جبکہ پہلا شمارہ جولائی میں اشاعت پذیر ہوا۔ ظفر علی خان نے اس رسالے کا اجرا "Mysteries of London" کے ترجمے جو وہ ان دنوں کر رہے تھے کی اشاعت کے لیے کیا۔ یہ ترجمہ "فسانہ لندن" کے عنوان سے رسالہ "افسانہ" میں شائع ہوا۔ مولانا کے بعض وقائع نگاروں نے اس کا عنوان "اسرارِ لندن" لکھا ہے جو کہ درست نہ ہے، مثلاً غلام حسین ذوالفقار "ظفر علی خان۔ ادیب و شاعر" میں لکھتے ہیں:

> "ظفر علی خان نے حیدر آباد دکن میں سنہ ۱۹۰۲ء کے اواخر میں "افسانہ" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس میں مسٹریز آف لندن کا ترجمہ "اسرارِ لندن" کے عنوان سے شائع کیا۔"[۵]

اس رسالے کی ابتدائی قیمت ۲ سکہ انگریزی اور ۸ سکہ حالی متعین کی گئی اس رسالے کے اجرا کے مقصد کے متعلق ظفر علی خان شمارہ اول کے صفحہ اول پر رقم طراز ہیں:

> ''1۔ یہ رسالہ حیدر آباد دکن سے ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرے گا اور اس کا حجم پچاس صفحے ہو گا۔ 2۔ اس میں صرف ایسے ناولوں کا ترجمہ یکے بعد دیگرے درج ہوا کرے گا جو دلچسپ اور پر لطف ہونے کے ساتھ مذہب اور نتیجہ خیز ہوں گے۔ ترجمہ میں اس بات کا التزام خاص کیا گیا ہے کہ اصل کے مطابق اور ساتھ ہی فصیح و بامحاورہ ہو۔''(۶)

مولانا کا ارادہ تھا کہ وہ اس رسالے میں مختلف ناولوں کے تراجم شائع کرتے رہیں گے لیکن ان کی بے چین طبع صرف ایک ترجمے ہی پر اکتفانہ کر سکتی تھی اور نہ ہی ان کی فکر اتنی محدود تھی لہٰذا بہت جلد کہ ابھی ''فسانہ لندن'' بھی مکمل نہ چھپا تھا کہ مولانا نے ایک نیا رسالہ ''دکن ریویو'' (جنوری ۱۹۰۴ء) کے نام سے جاری کر دیا۔ ''فسانہ لندن'' کی کچھ اقساط ''دکن ریویو'' کے ساتھ بھی شائع ہوئیں۔

دکن ریویو:

''دکن ریویو'' (جنوری ۱۹۰۴ء) ایک ماہانہ رسالہ تھا جس میں علمی و ادبی تحریریں شائع ہوتی تھیں، نیز ادبیات اردو کا جدید تنقیدی اصولوں کے مطابق جائزہ بھی لیا جاتا تھا بہت جلد یہ رسالہ برصغیر کے علمی حلقوں میں اپنی وقعت پیدا کر گیا۔ ہندوستان میں ''دکن ریویو'' کے معاصر ادبی رسائل مثلاً شیخ عبدالقادر کا ''مخزن''، عبدالقادر کا، عبدالحلیم شرر کا ''دلگداز'' وغیرہ جاری تھے۔ ''دکن ریویو'' ان رسائل سے کسی طور پیچھے نہ رہا۔ ''دکن ریویو'' میں لکھنے والے چند ادبا کے نام درج ذیل ہیں: شبلی نعمانی، اکبر الٰہ آبادی، مولوی عبدالحق، رضا علی وحشت، سید علی حیدر طباطبائی، سر کشن پرشاد، مرزا محمد ہادی عزیز، سید فضل حق، سید کاظم حسین شیفتہ، نواب نصیر حسین خیال وغیرہ۔

> ''دکن ریویو'' چھوٹے سائز کے باون (۵۲) صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور سرورق قدرے موٹے کاغذ کا ہوتا تھا۔ رسالہ کی طباعت اور کتابت معیاری تھی اور ایڈیٹر کی محنت اور خوش ذوقی کی آئینہ دار تھی۔ ہر مورچے میں آرٹ پیپر ایک عکسی تصویر بھی

شائع کی جاتی تھی۔ شخصی تصاویر نامور لوگوں کی ہوتی تھیں اور اس کا شخصیت کا ایک تعارف نامہ بھی رسالے کے صفحات کی زینت ہوتا تھا۔" (۷)

"دکن ریویو" اردو زبان وادب کی خدمت میں نمایاں خدمت سرانجام دے رہا تھا لیکن اس کی اشاعت میں ترتیب اور توازن نہ آسکا (جس کی بہت سی وجوہات ہیں جن کا آئندہ صفحات میں ذکر آئے گا) کبھی آٹھ دس ماہ کا وقفہ آجاتا اور کبھی تین تین چار چار شمارے اکٹھے بھی آجاتے۔ بعض خاص نمبر بھی شائع کیے گئے۔ جن میں "اسلام نمبر" خاص معروف ہوا۔ اس نمبر کے بارے میں غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

"۱۹۰۷ء میں انھوں نے "دکن ریویو" کے دو ضخیم "اسلام نمبر" نکالے۔ ان میں عالم اسلامی کے سیاسی و معاشرتی کوائف پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے طویل مضمون "العالم الاسلامی" میں اسلامی ملک کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم کی تھیں اور ظفر علی خان نے "اتحاد بین المسلمین" پر سیر حاصل بحث کر کے اس تصور کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا تھا۔"(۸)

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ "دکن ریویو" اور "افسانہ" اکٹھے ہی شائع کیے جاتے رہے اور ان رسائل کی ضخامت ۵۶ صفحات پر مشتمل تھی اس میں "دکن ریویو" کے لیے ۳۲ صفحے مختص تھے۔ عام طور پر "دکن ریویو" کو الگ انفرادی حیثیت ہی سے مولانا کے وقائع نویسوں نے متعارف کرایا ہے لیکن فی الحقیقت مولانا نے "افسانہ" کے ساتھ ہی یہ پرچہ شامل کیا تھا۔ اس ضمن میں مولانا "دکن ریویو" کا پہلا سال ختم ہونے کے بعد اگلے سال کے پہلے اداریے میں لکھتے ہیں:

"اس وقت تک پورے پرچہ کی قیمت تین روپے سکہ انگریزی اور صرف "دکن ریویو" کی قیمت دو روپے پانچ آنے ڈاک کے محصول کے علاوہ تھی۔ کل پرچہ کا حجم ۵۶ صفحے تھا جس میں "دکن ریویو" کے ۳۲ صفحے رکھے گئے تھے۔"(۹)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں رسائل اکٹھے ہی شائع ہوتے تھے، البتہ قارئین کی سہولت کے لیے ان کی الگ الگ خرید کی بھی اجازت تھی۔ جس شمارے کا اوپر کا اقتباس درج کیا گیا ہے اسی کے ایڈیٹوریل میں مولانا نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ آئندہ سال جنوری ۱۹۰۵ء سے "افسانہ" بند کر دیا

جائے گا اور صرف "دکن ریویو" والا حصہ ہی اشاعت پذیر ہوا کرے گا۔ مولانا کی تحریر سے ہی دونوں رسائل کے اکٹھے شائع ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "سالِ آئندہ یعنی جنوری ۱۹۰۵ء سے پرچہ کے نام سے افسانہ کا لفظ حذف کر دیا جائے گا
> اور صرف "دکن ریویو" رہنے دیا جائے گا جو بجائے خود ایک جامع نام ہے۔"(۱۰)

جب "دکن ریویو" کے ساتھ "افسانہ" کا شائع ہونا موقوف ہوا تو مولانا کو بہت سے قارئین نے خط لکھے جس میں "افسانہ" کے دوبارہ اجرا کی درخواست کی گئی۔ اپنے ایک ایڈیٹوریل میں مولانا ظفر علی خان اپنے ایک دیرینہ ساتھی میر حیدر علی خاں کے خط کا اقتباس بھی شائع کیا جس میں "افسانہ" کے از سرِ نو اجرا کی درخواست کی گئی۔ میر حیدر علی خان کا کہنا تھا کہ "دکن ریویو" کی ساری دلچسپی صرف "افسانہ" کے سبب سے تھی ورنہ "دکن ریویو" کے مضامین اور مقالات اتنے دلچسپ اور وقیع نہیں ہیں کہ اپنے معاصر رسائل "مخزن" اور "زمانہ" وغیرہ کا مقابلہ کر سکیں۔(۱۱)

بہر حال "فسانہ لندن" کی دلچسپی اور مقبولیت اپنی جگہ لیکن "دکن ریویو" معیار اور انتخاب میں کسی بھی دوسرے معاصر رسالہ سے کمتر نہیں تھا، بلکہ علمی و ادبی حلقوں کی جانب سے مولانا کے طرزِ صحافت اور انتخابِ موضوعات کو سراہا جاتا رہا، بعض صاحبِ علم لوگوں نے تعریف و توصیف کے جو خطوط مولانا ظفر علی خان کو لکھے ان کے اقتباسات انھوں نے بعض ایڈیٹوریلز میں شائع بھی کیے۔

حیدر آباد دکن کے حالات میں کچھ تبدیلی ہوئی؛ مولوی عزیز مرزا جو دکن میں ہوم سیکرٹری تھے وہ ڈپٹی کمشنر گلبرگہ متعین ہو گئے اور میر محفوظ علی بدایونی مجسٹریٹ ہو کر سومالی لینڈ چلے گئے؛ احباب کے یوں بکھر جانے سے ظفر علی خان کا جی بھی ملازمت سے اچاٹ ہونے لگا۔ مولوی عزیز مرزا کی جگہ نواب سر بلند جنگ محکمہ عدالت و امورِ عامہ اور کوتوالی کی معتمدی پر مامور ہوئے۔ نواب صاحب سخت مزاج شخص تھے اور ظفر علی خان کا مزاج یکسر مختلف تھا، اس سے پیشتر کے اختلافات رونما ہوتے ظفر علی خان خود ہی حیدر آباد دکن سے کنارہ کش ہو گئے۔ مولانا کے دکن سے چلے جانے کے متعلق مختلف آرا ہیں جو زیادہ معتبر اور موزوں ہے وہ کچھ یوں ہے:

> "نواب صاحب کچھ تنک مزاج اور ترش رو تھے۔ ظفر علی خان سے ان کی کیسے نبھ سکتی
> تھی؟ ان کی جودتِ طبع کو ایک نیا مضمون ہاتھ آ گیا۔ مرزا رفیع سودا تو تھے نہیں کہ
> "غنچہ" کو قلمدان لانے کے لیے کہتے۔ قلم اٹھایا اور ہجو کہہ ماری۔ پیشتر اس کے کہ یہ

ہجو عام ہوتی اور نواب سربلند جنگ کو خبر ہوتی ظفر علی خان نے ایک سال کی رخصت لی اور اپنے عزیز دوست میر محفوظ علی بدایونی کے پاس بربرہ (سومالی لینڈ چلے گئے)۔"[١٢]

میر محفوظ علی بدایونی صاحب سے مولانا کی ملاقات تقریباً سال بھر کے وقفے سے ہوئی تھی؛ ادھر وہ بھی نوکری سے زیادہ خوش نہیں تھے اور زندگی گزارنے کا کوئی اور ڈھب سوچ رہے تھے اور یوں دونوں دوستوں نے کاروبار میں قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔

مولانا ظفر علی خان حیدر آباد دکن سے سومالی لینڈ ہوتے ہوئے بمبئ چلے آئے اور اپنے دیرینہ ساتھی میر محفوظ علی بدایونی کے ساتھ مل کر کاروبار کرنے کی ٹھانی۔ اس ضمن میں غلام حسین ذوالفقار رقم طراز ہیں:

"دونوں دوستوں نے مل کر بمبئ میں امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھولنے کی ٹھانی۔ چنانچہ بمبئ میں ایک مکان کرائے پر لیا گیا اور اورئینٹل کمرشل ایجنسی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ بناڈالا گیا۔ جاپان سے ریشم اور افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان درآمد کیا گیا، مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ دونوں دوست ادیب تھے اور یہ مسئلہ کاروبار کا تھا جس کے لیے تخیل سے زیادہ حقیقت پسندی کی ضرورت تھی۔ تھوڑے دنوں میں کاروبار ٹھپ ہو گیا۔"[١٣]

میر محفوظ علی بدایونی شکستہ دل اور مایوس ہو کر اپنے گھر بدایوں چلے گئے اور ظفر علی خان بمبئ میں ہی مقیم رہے اور زندگی گزارنے کا کوئی نیا ڈھب تلاش کرنے لگے۔ فرصت کے انہی ایام میں انھوں نے بمبئ سے "دکن ریویو" جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی دو تین شمارے ہی نکلے تھے کہ مولانا بھی "دکن ریویو" کی جنم بھومی حیدر آباد دکن واپس آ گئے۔ یہاں واپس آ کر علمی و ادبی سرگرمیوں کا درخشاں دور از سرِ نو شروع ہوا لیکن یہ دور بھی زیادہ طویل ثابت نہ ہو سکا اور مولانا کو "دکن ریویو" بند کرنا پڑا۔ آپ رسالے کی ادارت اور ملکیت سے دستبردار ہو گئے اور رسالہ مولوی مودود احمد قادری کو دے دیا گیا۔ وقت کی کمی اور سرکاری مصروفیات کے ساتھ ساتھ کمزوری صحت کا بہانہ مولانا نے بطورِ وجوہ بیان کیا در حقیقت مولانا کو اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ دکن میں ان کے خلاف سازشیں عروج پر ہیں۔ دکن کی محلاتی سیاست میں جو اتار چڑھاؤ آتے تھے ظفر علی خان بھی اس کا شکار ہوئے۔ مولانا کے مخالفین نے ان پر جو اعتراضات عائد کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مولانا سرکاری ملازم ہوتے ہوئے کیسے ایک رسالے کا اجرا کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف ایک تھیٹر میں رقص و سرور میں شریک فنکاروں کا شکریہ ادا کرنے کی ذمہ داری مولانا کو تفویض کی گئی چونکہ مولانا اس قسم کے ثقافتی پروگراموں کو شعائرِ اسلامی کے خلاف سمجھتے تھے، لہٰذا

انھوں نے بڑی جرأت اور بے باکی سے بجائے تعریف و توصیف کے اس ثقافتی شو کی مذمت شدید الفاظ میں کر ڈالی۔ مخالفین کو موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے انگریز ریزیڈنٹ سر مائیکل ایڈوائر کے کان میں مولانا کی یہ جراتِ رندانہ ڈال دی اور ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کیا کہ مولانا شدت پسندوں اور جمال الدین افغانی کی تحریک سے متاثر ہیں۔ لہٰذا مولانا زیرِ عتاب آئے اور دکن بدر کر دیے گئے۔

ایک تاثر یہ بھی تھا کہ مولانا میر عثمان خان ولی عہد ریاست دکن کو نظام کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے چونکہ ظفر علی خان میر عثمان علی خان کے قریب تھے اور امورِ سیاست میں ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ شاید اسی لیے مولانا ظفر علی خان کے بعض وقائع نویسوں نے ان کو ولی عہد کا اتالیق بھی لکھا ہے۔ بہر حال مولانا کسی بھی بغاوت میں شریک نہ تھے بلکہ وہ ریاست حیدر آباد دکن کے خیر خواہ اور اس سے محبت کرنے والے تھے البتہ ان کا یہ خیال ضرور تھا کہ حیدر آباد دکن ایک خود مختار سلطنت کا روپ دھارے اور نظام کو ہز میجسٹی کا خطاب دیا جائے۔ سر مائیکل ایڈوائر کو مولانا اور ان کے رفقا کے ان نظریات کی بھنک پڑ گئی اور اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مولانا اور ان کے بعض احباب کو جن میں مولوی عزیز مرزا بھی تھے، دکن سے نکلوا دیا۔ چنانچہ مولانا ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو اپنے آبائی وطن کرم آباد پنجاب آ گئے جہاں ان کے والد ماجد مولوی سراج الدین احمد علیل تھے لہٰذا آتے ہی مولانا ان کی تیمار داری میں مصروف ہو گئے۔

زمیندار:

ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد علم و ادب سے خاص شغف رکھتے تھے۔ شاعری سے بھی دلچسپی تھی لیکن اپنے والد مولوی کرم الٰہی کے ٹوکنے اور منع کرنے پر شعر گوئی ترک کر دی۔ عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے اور دونوں زبانوں کی تعلیم اپنے والد مولوی کرم الٰہی سے گھر ہی پر حاصل کی۔ مولوی کرم الٰہی کے ایک بنگالی شاگرد سے پڑھ کر انگریزی میں بھی استعداد بہم پہنچائی۔ فارغ التحصیل ہو کر محکمہ ڈاک میں ملازمت کر لی اور مختلف مقامات پر تعینات رہے۔ بعد ازاں کشمیر چلے گئے اور محکمہ ڈاک و تار سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو کر اپنے آبائی گاؤں کرم آباد آ گئے بعد ازاں لاہور سے ہفت روزہ زمیندار کا اجرا کیا۔ پھر اس رسالہ کو کرم آباد لے آئے۔ "زمیندار" کے اجراء کا مقصد کاشت کاروں اور زمینداروں کی معاشرتی و معاشی اصلاح تھا۔ انھوں نے میاں محمد شفیع کے ساتھ مل کر ایک زمیندار ایسوسی ایشن کی بنیاد بھی رکھی جس کا مقصد زمینداروں کے حقوق کا تحفظ کرنا اور ان کے فلاح و بہبود کے کام کرنا تھا۔ مولوی سراج الدین احمد نے سماج کے اس

پسے ہوئے اور محنتی طبقے میں شعور اجاگر کرنے کے لیے اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں۔ ظفر علی خان نے ''زمیندار'' اور اپنے والد کے متعلق لکھا ہے:

> ''سب سے پہلے اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لحاظ سے آپ نے ایک اخبار بنام ''زمیندار'' جاری کیا اور اس کے ذریعہ سے اپنی آواز جو گم کردہ راہ کارواں کے لیے بہ منزلہ بانگِ درا تھی، زمینداروں تک پہنچانی شروع کی۔ یہ آواز اول اول بہت ہی دھیمی اور مدھم تھی لیکن رفتہ رفتہ بلند اور پاٹ دار ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ دشت و جبل اور وادی کہسار اس سے گونج اٹھے اور ایک اخبار ''زمیندار'' نے چند سال کے عرصے میں وہ کام کیا جو بڑی سے بڑی طاقتوں نے صدیوں سے انجام نہ دیا تھا۔ زمیندارانِ پنجاب میں حرکت اور بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔''(۱۴)

''زمیندار'' اخبار کی کاوشوں سے زمیندار طبقے میں شعور اور بیداری کا جذبہ بیدار ہوا اور ان کے حقوق جو عرصے سے پامال کیے جا رہے تھے ان کے حصول پر یہ طبقہ آمادہ ہوا۔ مولوی سراج الدین احمد اپنے اخبار ''زمیندار'' کو ترقی کی منازل طے کرتے دیکھنا چاہتے تھے لیکن قضا و قدر نے انھیں مہلت نہ دی؛ انھوں نے اسے اپنے بیٹے ظفر علی خان کے سپرد کیا اور نصیحت کی کہ اس کی دیکھ بھال، اشاعت اور بہتری کے لیے کوئی سستی نہ کی جائے۔ مولوی سراج الدین احمد کی مردم شناس نگاہوں نے ظفر علی خان کی شخصیت میں موجود خوبیوں اور مہارتوں کو پہچان لیا تھا، بلکہ ''دکن ریویو'' کشمیر میں ان کی ملازمت کے دوران میں ان کے زیرِ مطالعہ رہتا تھا اور وہ ''''دکن ریویو'' کی تحریروں اور طرزِ صحافت کے معترف تھے جس کا اظہار انھوں نے ظفر علی خان کے نام ایک پیغام میں بھی کہا تھا۔

> ''خدا خوش ارد و علم و ادب میں روح پھونک رہے ہو۔ عید الفطر کے روز میرے ہاں بہت خوش مذاق و تعلیم یافتہ اصحاب کا مجمع تھا جس میں علاوہ نذیر احمد صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کشمیر کے کئی دیگر علی گڑھ گریجوایٹ بھی تشریف رکھتے تھے۔ ''دکن ریویو'' کے مضامینِ نظم و نثر سے بڑھ کر دوسری غذائے روح کیا ہو سکتی تھی وہ وہ ریڈنگ ہوئے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ سب لوگ عش عش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ سخن را بر سر کرسی نشاندی۔ خدا ''دکن ریویو'' کی عمر دراز کرے اور آپ کو تادیر اس کے سر پر سلامت رکھے۔''(۱۵)

مولوی سراج الدین احمد کو ظفر علی خان سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ ان پر پورے اترے اور "زمیندار" کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک لے گئے۔ اب "زمیندار" صرف زمینداروں اور کاشت کاروں کے مسائل کے احاطے تک محدود نہ رہا، بلکہ "کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے" مصداق پوری امتِ مسلمہ کے جذبات کی ترجمانی کرنے لگا۔ ملکی اور عالمی سطح پر وہ واقعات رونما ہوئے جنھوں نے ظفر علی خان کی سمندِ فکر کے لیے تازیانے کا کام دیا۔

> "جب مولانا ظفر علی خان نے اپنے والد مولوی سراج الدین احمد کی وفات پر ہفت روزہ "زمیندار" کی ادارت سنبھالی تو یہ اخبار اپنی روایات کے مطابق ایک نہایت ہی معتدل روش پر گامزن تھا۔ اتنے میں پے در پے ایسے واقعات ہوئے جن سے برعظیم کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ تقسیمِ بنگال کی تنسیخ، حادثہ کانپور، جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان نے جہاں "زمیندار" کو ایک پرجوش اور طوفانی صحافت کا نقیب بنا دیا وہاں لیلائے سیاست نے انھیں اس عشوہ و ادا سے اپنی طرف کھینچا کہ وہ اسی کے ہو رہے۔"(١٦)

کرم آباد کی محدود فضا اور ماحول میں "زمیندار" صحافت کی ان منازل کو طے نہیں کر سکتا تھا جو بعد میں اس کا مقدر ہوئیں اس بات کا ادراک ظفر علی خان کو بھی تھا اور ان کے بعض احباب مثلاً سر شہاب الدین وغیرہ نے بھی ان کو مشورہ دیا کہ آپ "زمیندار" کو لاہور سے شائع کریں۔ ظفر علی خان نے اس صائب مشورے پر عمل کیا اور "زمیندار" کا دفتر لاہور میں بادشاہی مسجد کے قریب ہیرا منڈی کے بازار میں ایک مکان منتقل کر دیا۔ لاہور آ کر "زمیندار" کی سابقہ روش یکسر تبدیل ہو گئی اور اس نے مقامی مسلمانوں کی حالتِ زار کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے بھی لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کیا۔ لاہور میں اس وقت اردو کے دو اخبار صحافت کے منظر نامے پر بہت واضح تھے۔ ایک "وطن" اور دوسرا "پیسہ اخبار" ان اخبارات کی پالیسی مصلحت پسندی اور سب اچھا ہے دکھانا تھی۔ لیکن ظفر علی خان نے لوگوں کو حقیقت کا آئینہ دکھایا۔ عوام کے مسائل کو صحیح معنوں میں اجاگر کیا یہی وجہ ہے کہ جلد ہی مذکورہ بالا اخبارات کی سرکولیشن محدود ہوتی گئی اور "زمیندار" عوام خواص میں یکساں مقبول ہوتا گیا، یہاں ایک جملہ معترضہ یہ بھی ہے کہ پیسہ اخبار اور "وطن" کے مالکان اور ایڈیٹران نے ظفر علی خان اور "زمیندار" کی بڑھتی مقبولیت سے خائف ہو کر کاروباری چشمک کی ابتدا کر دی؛ ظفر علی خان کی کردار کشی کی گئی ان

کی پالیسیوں پر تنقید کی گئی۔ الغرض گھمسان کارن پڑا لیکن "زمیندار" تمام تر رکاوٹوں کے باوجود لوگوں کا پسندیدہ اخبار بن گیا۔ ظفر علی خان کے معاصر ابوالکلام آزاد اپنے اخبار "الہلال" میں لکھتے ہیں:

> "روزنامہ زمیندار کی اشاعت سے پہلے اخبار بینی طبقہ میں محدود تھی اور عام بیداری و احساس کے پیدا ہونے میں ایک ایسا مانع عظیم تھا جس کی وجہ سے کوئی تحریک اور کوئی آواز عام قوت و اثر پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ جنگِ طرابلس نے قوم کے تمام طبقات کو خبروں کا شائق بنایا اور زمیندار کی عام مقبولیت شروع ہو گئی۔ اس کی اشاعت بیس بیس ہزار روزانہ تک پہنچی اور اس کی ارزانی اور عام فہم ہونے نے اسے عام دکانداروں اور بازار کے بیٹھنے والوں تک پہنچا دیا۔ ہر شخص جو اردو عبارت پڑھ سکتا ہے، علی الصباح اس طرح زمیندار کا خواہش مند ہوتا تھا، گویا یورپ اور امریکہ کا ایک تعلیم یافتہ عادتاً صبح کے وقت مطالعۂ اخبار کے لیے بے قرار ہے۔"(١٧)

"زمیندار" نے عالمِ اسلامی کے متعلق خبریں دے کر لوگوں کے جذبات کی درست انداز میں ترجمانی کی، لوگوں کے اندر شعور پیدا ہوا؛ جوش و جذبہ سے قوم کا ہر فرد سرشار ہو گیا۔ خواص اور پڑھے لکھے لوگ تو رہے ایک طرف ان پڑھ آدمی بھی اخبار خریدتا؛ دو آنے میں اخبار خریدا جاتا اور ایک آنے میں پڑھوائی کروا کے سنا جاتا۔ ایک دور تو ایسا آیا کہ "زمیندار" کی صبح و شام اشاعت کا اہتمام بھی کیا گیا۔ ظفر علی خان نے جہاں "زمیندار" کے مزاج اور رجحان کو یکسر بدل دیا وہاں انھوں نے اردو صحافت کو بھی بہت متاثر کیا۔ اردو صحافت کے انداز، اسلوب، رجحانات میں جو اختراعات اور جدتیں آئیں وہ ظفر علی خان ہی کے طرزِ صحافت کے سبب تھیں۔ یورپی طاقتیں جس طرح ترکی کا استحصال کرنا چاہتی تھیں اور جب ١٩١٠ء میں اٹلی نے دیگر یورپی طاقتوں کی آشیر باد سے اپنی فوجیں طرابلس کے ساحلوں پر اتاریں؛ اس سے ہندوستان کے اور دنیا بھر کے مسلمانوں میں شدید غم و غصہ پیدا ہوا اور وہ سمجھنے لگے کہ یورپ ان کے حقوق کو بری طرح پامال کرنے پر آمادہ ہو چکا ہے۔ یہی واقعہ پہلی جنگِ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ انہی حالات میں ظفر علی خان کا "زمیندار" عوام کے جذبات کی ترجمانی میں مصروف تھا، اور لوگوں کے اندر ایک جوش و ولولہ پیدا کر رہا تھا کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کریں۔ چنانچہ ظفر علی خان نے ضرورت محسوس کی کہ اخبار ہفت روزہ کی جگہ روزنامہ کر دیا جائے اور یوں ١٥ اکتوبر ١٩١١ء سے روزنامہ "زمیندار" کا

ایڈیشن شائع ہوا۔ "زمیندار" کے مسلم عوام کی معاشرتی اصلاح اور مختلف اقوام کے درمیان اتحاد و یگانگت اور رواداری پر بھی زور دیا ہے اس لیے یہ ہندوستان کی تمام عوام میں یکساں طور پر مقبول ہوا۔

"زمیندار" نے اردو صحافت کو ایک نئی عظمت سے روشناس کرایا، سطحیت سے وجاہت میں بدلا اور اردو میں پرچہ نویسی کے بجائے اخبار نویسی کا اعلیٰ ذوق پیدا کیا۔ ظفر علی خان نے اپنی صحافتی تحریروں سے اخبار کی شعر و ادب کی چاشنی کو اضافہ دیا۔ ظفر علی خان کی تحریروں کی ادبیت سے متاثر ہو کر ایک وسیع طبقہ اردو اخبارات کی اہمیت کا معترف ہوا۔ "زمیندار" کا حسن صرف ظفر علی خان کی تحریریں ہی نہیں تھیں بلکہ مولانا نے اپنے ذوق سے کام لے کر اخبار نویسی کے انداز و اطوار میں بھی قابلِ قدر اور دل کش تبدیلیاں کی تھیں۔ انھوں نے ادارتی صفحے کی ترتیب بدل کر اس میں ایک تنوع پیدا کیا۔ "زمیندار" میں ہی ادبی نوک جھونک کی صورت گری کی، ادارتی صفحے میں مقالہ افتتاحیہ کے ساتھ طنزیہ اور مزاحیہ کالم کا اجرا کیا جو بعد ازاں مولانا عبدالمجید سالک لکھتے رہے، اخباری شاعری کی بنیاد رکھی جو رفتہ رفتہ ہجو نویسی اور طنز نویسی کا طرز اختیار کر گئی۔ ظفر علی خان نے اخبار کے ظاہری حسن اور اس کی پیش کش میں بھی نمایاں تبدیلیاں کیں جو بعد میں رجحان ساز ثابت ہوئیں، کالمی سرخیوں اور عنوانی سرخیوں کا رواج بھی اردو صحافت کو انھی کی دین ہے، اردو صحافت کو نئے نئے الفاظ اور جدید تراکیب سے نوازا جس سے اردو صحافت کی لغت میں اضافہ ہوا۔ "زمیندار" سے پہلے اردو کا کوئی بھی اخبار نیوز ایجنسیوں سے بلاواسطہ خبروں کو حاصل نہیں کرتا تھا۔ یہ سہرا بھی "زمیندار" کے سر ہے کہ اس نے رائیٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا سے براہِ راست خبریں حاصل کیں۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے جنگِ بلقان اور طرابلس کے زمانے میں "زمیندار" کی اشاعت تیس ہزار تک پہنچ گئی۔(۱۸) اس زمانے میں یہ کسی بھی اردو اخبار کی بہت بڑی سرکولیشن اور کامیابی تھی۔

ظفر علی خان نے زمیندار میں جہاں تازہ بہ تازہ خبروں سے لوگوں کو آگاہ کیا وہاں یورپ کے جنگی جنون اور امتِ مسلمہ کے دگرگوں حالات کے تنقیدی تجزیوں نے جو "زمیندار" کے صفحات کی زینت بنتے تھے۔ اخبار کی وقعت اور پسندیدگی میں اضافہ کیا۔ عوام میں اس اخبار کو جہاں قبولِ عام حاصل ہوا وہاں انگریز سامراج کی طرف سے قدغن بھی لگا دیے گئے۔ زمیندار کی ابتلا و مصیبت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ "زمیندار" سے اولاً ایک ہزار روپیہ بطور صحافت طلب کیا گیا؛ اس کی ضبطی کے بعد مزید ضمانتیں طلب کی گئیں جن کی تعداد کافی زیادہ ہے، رقم بھی بڑھا کر پانچ سے دس اور پھر پندرہ ہزار کر دی گئی، یہ سب ضمانتیں ضبط کر لی گئیں۔ سر مائیکل ایڈوائیر جب

پنجاب کا لیفٹنٹ گورنر متعین ہوا تو ظفر علی خان اور زمیندار کے لیے مزید مشکل دور آیا۔ ضمانتوں کے ساتھ ساتھ پریس بھی ضبط کیا گیا۔

جب انگریز سامراج کی سختیاں بڑھتی گئیں تو ''زمیندار'' کا مزاج بھی بدلتا گیا۔ ظلم و ستم، پے در پے ضبطیاں، جرمانے، قید و بند سے ظفر علی خان کے پائے استقامت میں لرزش نہ پیدا کی جا سکی اور وہ اور زیادہ تندی اور سختی کے ساتھ برطانوی استعمار سے برسرپیکار ہوئے۔ ظفر علی خان کے متعلق تاجور نجیب آبادی لکھتے ہیں:

> ''یہ قہرمانِ میدان ادب و صحافت اپنی ہنگامہ آفرین شخصیت کے اعتبار سے آج اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس کی فلک فرسا ہمت، اولوالعزمی اور مصائب آرائی نے اسے تاریخ صحافت کا غیر فانی ہیرو بنا دیا ہے۔ قانون کی پیچ در پیچ بندشوں سے اس کی فطرت ابا کرتی ہے اور خطرات و عواقب پر ہنستا ہوا وہ ان نظربندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ زمانہ ناسازگار کو بھی اس سے ضد سی آپڑی ہے کہ اس نے اپنی چیرہ دستیوں کے لیے چن لیا ہے۔ جیل، جرمانے، ضمانتیں، خانہ تلاشیاں، قرقیاں، ضبطیاں، غرض قانون کی کوئی گرفت ایسی نہیں جو اسے مجبور کرنے کے کام نہ آئی ہو لیکن قانون کو بھی اس جیسے دل گردہ رکھنے والے انسان سے بہت کم واسطہ پڑا ہو گا کہ قانون کی پیدا کی ہوئی ہر بربادی کے بعد ظفر علی خان کی خاک سے ایک چاک چوبند نعرے مارتا ہوا زندہ ظفر علی خان نمودار ہو جاتا ہے۔''[19]

مولانا کے مزاج اور رویے کا اثر ان کے اداریوں کے ساتھ اخبار کی مجموعی پالیسی پر بھی ہوا؛ اس بات کا اندازہ ''زمیندار'' کے سرورق ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ جب ''زمیندار'' مولوی سراج الدین کی ادارت میں نکلتا تھا تو اس کی پیشانی پر قرآن حکیم کی ایک آیت کا ترجمہ لکھا ہوتا تھا کہ: ''خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی حالت آپ نہ بدلے'' اس کے ساتھ ایک شعر بھی مرقوم ہوتا تھا:

نام کو تو ہوں زمیندار اور اگر سوچو ذرا
قوم کا حاجت روا ہوں نوع کا مشکل کشا

جب ''زمیندار'' مولانا ظفر علی خان کی ادارت میں آیا تو انھوں نے اس شعر کو میر عثمان علی خان کے درج ذیل شعر سے بدل دیا:

تم　خیر　خواہِ　دولتِ　برطانیہ　رہو
سمجھیں　جناب　قیصرِ　ہند　اپنا　جاں　نثار

جب ''زمیندار'' پر پے در پے امتحانات آئے اور انگریز نے طرح طرح کی سختیاں کی ''زمیندار'' کی مجلسِ ادارت کو بارہا گرفتار کیا گیا۔ ضمانتیں ضبط کی گئیں، مطبع بھی ضبط کیا گیا؛ خود مولانا کو گرفتار کیا گیا تو ''زمیندار'' کی پیشانی سے یہ شعر ہٹا دیا گیا اور مولانا کا اپنا ایک شعر لکھا جانے لگا۔

نورِ　خدا　ہے　کفر　کی　حرکت　پہ　خندہ　زن
پھونکوں　سے　یہ　چراغ　بجھایا　نہ　جائے　گا

''زمیندار'' کی پیشانی پر جو قرآن کی آیت کا ترجمہ لکھا ہوتا تھا وہ بھی شعر کی صورت میں بدل گیا اور مولانا کا شعر جو بعد میں زبان زدِ عام ہو گیا، کو لکھا دیا گیا۔

خدا　نے　آج　تک　اس　قوم　کی　حالت　نہیں　بدلی
نہ　ہو　جس　کو　خیال　آپ　اپنی　حالت　کے　بدلنے　کا

اشعار کا یہ ردّ و بدل ''زمیندار'' اور ظفر علی خان کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ بدلتے حالات اور رونما ہوتے واقعات دونوں کے مزاج اور رجحانات پر اثرانداز ہوتے رہے۔ مولانا کی صحافتی تحریروں کا تفصیلی جائزہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

پنجاب ریویو:

حیدر آباد دکن کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ظفر علی خان جب اپنے آبائی گاؤں کرم آباد آ گئے اور اپنے والد مولوی سراج الدین احمد کی وفات کے بعد ان کے رسالے ہفت روزہ ''زمیندار'' کی ادارت سنبھالی لیکن ''زمیندار'' کا محدود کینوس ان کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس وقت تک ''زمیندار'' ابھی کسانوں اور زمینداروں کی معاشی اور معاشرتی اصلاحات پر ہی لکھتا تھا جبکہ مولانا حیدر آباد دکن میں ''دکن ریویو'' جیسا علمی و ادبی پرچہ چھوڑ کر آئے تھے لہٰذا اپنے مزاج کے عین مطابق انھوں نے ''دکن ریویو'' کی طرز اور پایہ کا میگزین ''پنجاب ریویو'' نکالنا شروع کیا۔ یہ رسالہ بھی ''دکن ریویو'' کی طرح ماہنامہ تھا اور اس کی ضخامت پچاس

صفحات تھی۔ ابتدا میں یہ رسالہ بھی کرم آباد سے شائع ہوتا رہا اور بعد ازاں "زمیندار" کے ساتھ مولانا اسے بھی لاہور سے آئے۔ "دکن ریویو" کی طرح اس رسالے میں بھی علمی و ادبی مضامین کی اشاعت کی جاتی۔

> "پنجاب ریویو بھی مشرق و مغرب کے صحت مند ادبی افکار کا ترجمان تھا جس میں انگریزی مضامین کے بامحاورہ اردو تراجم بھی شامل ہوتے تھے۔ ترجمہ کرنے کی صورت بقول حامد علی خان صاحب یہ ہوتی تھی کہ مولانا کے ہاتھ میں انگریزی میگزین یا رسالہ ہوتا تھا۔ حقے کا کش لگاتے تھے اور انگریزی مضمون کو اس طرح اردو میں لکھواتے جاتے تھے جیسے ان کے سامنے انگریزی نہیں بلکہ اردو میں لکھا ہوا مضمون ہو۔"[٢٠]

پنجاب ریویو میں اس عہد کے بڑے بڑے نام اپنے مضامین اور شاعری اشاعت کے لیے بھیجتے تھے، خود مولانا نے کئی شاندار اور بلند پایہ مضامین لکھے۔ مولانا کے کیے ہوئے تراجم بھی اس رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ رسالے میں جن ادبا کی تحریریں شائع ہوتی رہیں ان میں سے چند نام یہ ہے: مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولانا شبلی نعمانی، مولوی عزیز مرزا، مولوی عبدالحق، مولوی اسماعیل میرٹھی، علامہ محمد اقبال، اکبر الہ آبادی، علی حیدر طباطبائی، مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، مرزا سلطان احمد خان، حسرت موہانی، شاہ دین ہمایوں وغیرہ۔ ظفر علی خان کے پنجاب ریویو میں چھپنے والے وہ مضامین جنھوں نے بہت شہرت حاصل کی ان میں اسلام کی برکتیں، جمال الدین افغانی یہ (مضمون پروفیسر براؤن کی کتاب "انقلابِ ایران" سے ماخوذ ہے اور مولانا نے اس میں بہت علمی اضافے بھی کیے ہیں۔ بعد ازاں یہ مضمون الگ سے ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع ہوا) شامل ہیں۔

ظفر علی خان اسلامی اتحاد اور ملت اسلامی کی ترقی و فلاح کے آرزو مند تھے اور وہ ساری زندگی اس کے لیے کوشاں رہے وہ آزادی ہند کے لیے عمر بھر برسرپیکار رہے اپنوں بیگانوں سبھی کے دشنام سہتے رہے۔ انگریزوں نے اسلام پسندوں کے لیے اس عہد میں پان اسلام ازم کی اصطلاح وضع کی تھی اور وہ مولانا کو ہندوستان میں پان اسلام ازم کا سب سے بڑا نقیب سمجھتے تھے۔ "پنجاب ریویو" میں مولانا نے اس اصطلاح پان اسلام ازم پر خوب علمی گفتگوئیں کی ہیں جو آئندہ صفحات میں زیرِ بحث آئیں گی۔

ستارۂ صبح:

انگریز حکومت نے جب مولانا ظفر علی خان اور "زمیندار" پر پے در پے سختیاں شروع کیں تو مولانا کے لب و لہجے اور قلم میں سختی اور جارنہ پن آتا گیا جس کے سبب اخبار "زمیندار" کی کئی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ بالآخر

اکتوبر ۱۹۱۴ء کو ظفر علی خان کرم آباد میں انڈین پریس ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیے گئے۔ مولانا کی نظر بندی کے دوران میں ضمانت کے طور پر بیس ہزار کے مچلکے اور بیس ہزار کی شخصی ضمانت بھی دی گئی۔ بیس ہزار کی ضمانت میں سے دس ہزار کی ضمانت سردار خزاں سنگھ نے دی، پانچ ہزار کی ضمانت اکبر شاہ نے اور پانچ ہزار کی ضمانت مولوی محمود احمد خان نے دی۔[۲۱] کرم آباد میں نظر بند ہونے کے بعد مولانا کی تحریریں زمیندار میں چھپنی بند ہو گئیں اور ان کو مدیر کی حیثیت سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ پہلے تو مولانا کا نام بطور مالک اخبار کے طور پر زمیندار کے سرورق پر لکھا جاتا رہا لیکن حکومتِ وقت کو یہ بھی گوارا نہ ہوا لہٰذا مولانا نے ۱۱ مارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا نے اخبار کے حقوق کے ملکیت اپنی بیگم کے نام منتقل کر دیے اور اخبار پر مالک کے طور پر بیگم ظفر علی خان لکھا جانے لگا۔ لیکن اسی ظاہری تبدیلی کا اثر ''زمیندار'' کے مزاج اور رجحان پر کیا پڑتا اس نے اور شدت اور مخاصمت کا رویہ اختیار کر لیا۔ دوسری طرف حکومت کی طرف سے مزید سختیاں کی گئیں اور ''زمیندار'' جو پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستان کے لوگوں کو عالمی حالات و واقعات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سیاسی شعور بھی بیدار کر رہا تھا پر مزید قدغن لگائے گئے۔ اب ''زمیندار'' دن میں ایک مرتبہ کے بجائے دو مرتبہ نکلنے لگا۔ اس سے حکومت کی بدمزاجی میں اضافہ ہوا، نتیجتاً ''زمیندار'' کو بند کر دیا گیا۔ ظفر علی خان نظر بندی میں جس طرح زندگی گزار رہے تھے وہ ایک ادیب اور شاعر کی نہیں بلکہ ایک کاشت کار کی سی تھی۔ مولانا نے خود کو کھیتی باڑی اور پھولوں، پھلوں کی کاشت کاری میں مصروف کر لیا؛ انھوں نے آموں کے پودے اور انگوروں کی قلمیں منگوا کر لگوائیں لیکن ایک قلم کار کتنی دیر خود کو لکھنے پڑھنے سے دور رکھ سکتا تھا، لہٰذا مولانا اپنی پرانی دلچسپیوں کی طرف لوٹنا چاہتے تھے جس کی اجازت انھیں حکومت سے نہیں مل رہی تھی:

> ''اُن دنوں ظفر علی خان کے مالی حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ اخبار کی بندش سے حالت اور سقیم ہو گئی تھی۔ نظر بندی کے ساتھ تحریر و تقریر کے سلسلے بند ہو گئے تھے۔ انھوں نے کاروبار کے بارے میں سوچا اور شکر سازی کا کارخانہ لگانے کا پروگرام بنایا مگر حکومت نے اس کی اجازت نہ دی۔ پھر انھوں نے دائرہ معارف شرقیہ قائم کر کے اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھنے کا منصوبہ سوچا جس کی حکومت نے مشروط طور پر اجازت دی۔ یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی آخر کار کرم آباد سے ایک ہفتہ وار ادبی رسالہ نکالنے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ملی کہ اس پرچے میں سیاسی مسائل زیرِ بحث نہیں آئیں گے۔''[۲۲]

چنانچہ ۲۷ اگست ۱۹۱۷ء کو ایک ادبی پرچہ روزنامہ "ستارۂ صبح" جاری کیا گیا۔ اس دوران میں ایک اور واقعہ بھی پیش آیا کہ مولانا کی نظر بندی کے دوران میں ہی انھیں کسی باؤلے کتے نے کاٹ لیا اس زمانے میں کتے کے کاٹے کا علاج ہر جگہ نہیں ہوتا تھا اور اس سلسلے میں شملہ میں ایک علاج گاہ تھی؛ مولانا نے خط کتابت کے ذریعے حکومت کو اس واقعے سے آگاہ کیا اور شملہ جانے کی اجازت طلب کی جو فوراً دے دی گئی۔ مولانا نے بھی مصلحت اندیشی سے کام لیا اور اپنی سخت مزاجی اور حکومت مخالف جذبات میں کسی حد تک بدلاؤ لے آئے۔ شاید اس کی وجہ از سرِ نو اپنے اخبار پر سے بندشوں کے خاتمے کی خواہش تھی۔ بہر کیف "زمیندار" تو آزاد نہ ہو سکا لیکن مولانا کو ایک نیا روزنامہ "ستارۂ صبح" نکالنے کی مشروط اجازت مل گئی۔ ستارۂ صبح کے پہلے شمارے کی تصویر کشی عبدالسلام خورشید نے کچھ یوں کی ہے:

> "سرورق کے اوپر "ربِ زدنی علما" ماٹو کے طور پر درج ہے اس کے بعد یہ شعر دیا گیا ہے:
>
> مل　آں　ستارۂ　صبح　کہ　در　محلِ　طلوع
> ہمیشہ　پیش　روِ　آفتاب　می　باشم
>
> پھر اخبار کے نام کی تختی ہے اس کے نیچے ایک طرف "نشاۃ الثانیہ" کے عنوان سے مولانا ظفر علی خان کی ایک نظم درج ہے۔ جو اس اخبار کی معاشی اور معاشرتی پالیسی کا غماز ہے۔ اس کے بالمقابل اکبر الہ آبادی کا تازہ ترین کلام دیا گیا ہے۔ صفحہ ۴ پر "جواہر ریزے" کے عنوان سے مولانا کی سگ ریزی کے واقعہ، کسولی میں علاج، سر مائیکل ایڈوائر سے ملاقات اور روزنامہ صبح کے اجراء کی اجازت کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر دو صفحوں پر مشتمل ایک افتتاحیہ درج کیا گیا ہے۔۔۔۔ دو صفحات میں جنگی اور قومی خبریں ہیں۔ اس کے بعد "اسرارِ خودی" کے اشعار جلی قلم سے درج کر کے ان کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ حضرتِ علامہ اقبال کا ایک مقالہ بھی درج ہے جس کا عنوان ہے: "رسول اللہؐ فنِ شعر کے مبصر کی حیثیت میں۔ شاعری کا موضوعِ صحیح۔"(۲۳)

ستارۂ صبح پر اگرچہ سیاسی موضوعات کو زیر بحث لانے پر پابندی تھی لیکن مولانا بعض باتیں اشاروں اور کنایوں میں بھی کر جاتے تھے۔ مولانا کی تحریروں کو سنسر کیا جانے لگا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ مولانا مضمون لکھتے، سنسر

کی زد میں آجاتا۔ مولانا ترمیم و تنسیخ کر کے از سرِ نو لکھتے پھر سنسر کی زد میں آجاتا اور بعض دفعہ تو صورت ایسی بھی ہو جاتی تھی کہ مولانا نے پانچ دفعہ مضمون لکھا اور وہ پانچوں مرتبہ سنسر کیا گیا۔ مولانا نے اس اخبار کی مدد سے عوام کی ذہنی تعلیم و تربیت کا بیڑہ اٹھایا؛ لوگوں کی اخلاقی اور معاشی حالت کو بدلنے کے لیے جو مولانا نے اپنے اخبار کے لیے استعمال کیا۔ مولانا کے ہنگامہ خیز اور ہنگامہ پرور مزاج کو کوئی میدان تو چاہیے تھا اور وہ میدان انھیں نام نہاد پیرانِ طریقت اور خود ساختہ صوفیوں کا رد کرنے کی صورت میں میسر آگیا۔ مولانا نے بدعات کے استیصال کے لیے نہایت عمدہ مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کا مطمح نظر تھا کہ وہ برصغیر میں دینی اصلاح کا کام سرانجام دیں۔ مولانا ظفر علی خان نے قادیانی نبوت پر بھی ضرب کاری لگائی اور نبوت کے جھوٹے دعوے دار مرزا غلام احمد قادیانی کی ہرزہ سرائیوں اور مذہبی ریشہ دوانیوں کا جواب پوری طاقت، شدت اور دلائل و براہین کے ساتھ دیا۔

> ''دوسری اہم بحث جو ''ستارۂ صبح'' کا خصوصی موضوع بنی وہ طریقت اور شریعت کی دیرینہ آویزش کے حوالے سے متصوفین کے ایک گروہ کی متنازع فیہ روش تھی جو دراصل علامہ اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت کے بعد خواجہ حسن نظامی اور ان کے حلقے کے مقلدین کے ایک بڑے گروہ اور اقبال اور ان کے ہم خیال لوگوں کے مابین شروع ہوئی اور خاصی تلخ صورت اختیار کر گئی۔ ظفر علی خان اس معارضے میں اقبال کے ساتھ تھے۔''(۲۴)

یکم دسمبر ۱۹۱۷ء سے روزنامہ ''ستارۂ صبح'' کے ساتھ ہفت روزہ ''ستارۂ صبح'' کا آغاز بھی کیا گیا جو ''زمیندار'' کی طرز پر مہینے میں چار مرتبہ یکم، ۸، ۱۶، اور ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ یہ دونوں اخبار ایک دو شماروں کے بعد کرم آباد کے بجائے لاہور سے شائع ہونے لگے۔ مولانا اخبار کو مرتب کرتے اور اسلامیہ سٹیم پریس لاہور سے چھپ کر دفتر ''ستارۂ صبح'' ریاض بلڈنگ لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ ''ستارۂ صبح'' میں مولانا نے ایک مستقل مضامین کا سلسلہ ''جواہر ریزے'' کے عنوان سے شروع کیا جس میں مختلف علوم و فنون کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی بحث کی جاتی۔ مولانا کی ادبی اور صحافتی زندگی میں ''ستارۂ صبح'' بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس اخبار میں مولانا نے جس قدر اداریے اور مضامین لکھے وہ اپنی ''زمیندار'' کی پوری صحافتی زندگی میں وہ نہ لکھ سکے۔ ''زمیندار'' کی ادارت کے دوران میں چونکہ مولانا کے مشاغل اور مصروفیت کثیر الجہتی ہوتی تھیں اور مولانا مستقل وقت لکھنے کو نہیں دے سکتے تھے؛ بعض دفعہ کوئی اداریہ شروع کرتے، تھوڑا بہت لکھتے اور کسی اخباری جملے کے ساتھ کے حوالے

کر دیتے کہ اسے مکمل کر دے۔ "ستارۂ صبح" چونکہ نظر بندی کے زمانے میں جاری کیا گیا اور مولانا کے پاس فرصت کے لمحات میسر تھے، اس لیے اس اخبار کے لیے مولانا نے جو کچھ بھی لکھا وہ پوری توجہ اور کامل یکجہتی کے ساتھ لکھا۔ اسی لیے مولانا نے رفقا اور احباب نے مولانا کی نظر بندی اور قید کو آزادی سے زیادہ فائدہ مند بھی کہا ہے۔ "ستارۂ صبح" میں مولانا ظفر علی خان نے صوفیوں کے وہ پول کھولے اور تصوف کی تاریخ پر وہ علمی مضامین لکھے جس کا اثر ایک وسیع طبقے پر ہوا۔ مضامین پر یہی موقوف نہ تھا بلکہ مولانا نے کئی نظمیں بھی اس موضوع پر کہیں۔

مولانا کی نظم و نثر کی تاب نہ لاتے ہوئے طریقت کے بھیس میں دنیادار صوفیوں نے وہ طوفان اٹھایا اور انگریز حاکمین کے حضور ظفر علی خان کی شعلہ نوائی و بے باکی اور جرأتِ رندانہ کی شکایتیں کیں۔ انگریز جو پہلے ظفر علی خان سے خار کھائے بیٹھا تھا اور ان کا دیرینہ کرم فرما سر مائیکل ایڈوائر تو کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ چنانچہ مولانا پر مزید سختیاں کی گئیں۔ ظفر علی خان خود لکھتے ہیں:

> "نقلی صوفیوں اور جھوٹے پیروں کا پول "ستارۂ صبح" میں کچھ اس طرح کھولا گیا کہ دنیائے طریقت کے برخود غلط رہ نما چیخ اٹھے چنانچہ میرے خلاف ان بزرگوں نے ایک وسیع پیمانے پر سازش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ کس طرح میں ان کے راستے سے ہٹ جاؤں پہلے تو لاہور میں ایک دھوم دھامی جلسہ کیا جس میں مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا جو اب تک واپس نہیں لیا گیا اس پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا:
>
> کوئی ٹرکی لے گیا کوئی ایراں لے گیا
> کوئی دامن لے گیا کوئی گریباں لے گیا
> رہ گیا تھا نام باقی فقط اسلام کا
> وہ بھی ہم سے چھین کر حامد رضا خاں لے گیا
>
> اس کے بعد ایک میموریل تیار کیا گیا۔ جس پر طول و عرض ہند کے پیروں اور صوفیوں اور سجادہ نشینوں کے دستخط ثبت تھے۔ اس میموریل میں حکومتِ پنجاب سے استدعا کی گئی تھی کہ کس طرح میرا منہ بند کیا جائے یہ اسی میموریل کا نتیجہ تھا کہ مجھے پنجاب چھوڑنا پڑا اور کچھ عرصہ کے لیے حیدر آباد جا کر اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان کے دامن دولت میں پناہ لینی پڑی۔"(۲۵)

ایک طرف تو مولانا کے حریف یہ تھے، دوسری طرف قادیانی نبوت کے نام لیوا بھی پیچھے نہ رہے اور سر مائیکل ایڈوائر کے حضور جا کر مولانا کی شکایت کی جس کا ذکر انھوں نے ۲۵ جون ۱۹۲۰ء کے اداریے میں کیا ہے کہ "ستارۂ صبح" میں بشیر الدین محمود کی "خلافت" پر چند مدلل اور زبردست اعتراضات کیے جن کو کوئی جواب موصوف سے نہ بن پڑا کیونکہ دلائل ہی دندان شکن تھے، لہٰذا منہ بسورتے ہوئے اپنا آقا مائیکل ایڈوائر کے آشیانے پر ناصیہ فرسائی کرنے گئے "کہ اوں اوں اوں! دیکھیے ظفر علی خان ہمیں مارتا ہے۔" ظفر علی خان اپنے اداریے میں مزید لکھتے ہیں:

> "سر مائیکل پہلے ہی ہم سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، پنجے جھاڑ کر جھٹ ہمارے پیچھے پڑ گئے اور کہنے لگے کہ "اوہو" اس کا بھی یہ منہ ہے کہ ہمارے وفاداران ازلی و نمک خواران سرمدی کے منہ آئے۔ ہم ابھی اس زبان دراز کا ناطقہ بند کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ سر رشتہ سی۔ آئی۔ڈی کی شاخ مطبوعات کی وساطت سے ہمیں حکم ملا کہ "اگر تم نے مسیح موعود کی قادیانی بھیڑوں اور ان کے مقدس چرواہے مسٹر مرزا بشیر الدین محمود کو چھیڑا تو تمہاری زبان عرضہ مقراض سنسر بن جائے گی۔" ہم نے بہتیرا کہا کہ "اجی صاحب! یہ تو مذہبی جھگڑے ہیں، انھیں سیاست سے کیا تعلق؟ آپ کیوں اس پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہیں اور مسٹر مرزا کو تو نمک اور ہمیں سیندور کھیلاتے ہیں۔" لیکن ہماری ایک نہ سنی گئی اور ہمیں طوعاً و کرہاً مسٹر مرزا پر اعتراض سے سر مائیکل کی سرکار کے حکم سے رکنا پڑا۔"(۲۶)

الغرض انہی حالات کے پیش نظر ۱۹۱۸ء کے اوائل میں مولانا ظفر علی خان کو "ستارۂ صبح" بند کرنا پڑا۔

حوالہ جات

۱۔ "لاہور کرانیکل"، انگریزی اخبار ۱۱ نومبر ۱۸۵۷ء، بحوالہ: عبدالسلام خورشید' ڈاکٹر؛"کاروانِ صحافت" کراچی' انجمن ترقی اردو؛ سال ۱۹۶۴ء؛ ص:۴۵

۲۔ ایضاً؛ ص:۴۱

۳۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛ "ظفر علی خان۔ ادیب و شاعر"؛ لاہور' مکتبہ خیابانِ ادب؛ ۱۹۶۷ء؛ ص:۶۵

۴۔ ایضاً؛ ص:۶۸

۵۔ ایضاً؛ ص:۶۸

٦۔ ظفر علی خان، مولانا؛"رسالہ: افسانہ"؛حیدر آباد دکن' مطبع حیدر آباد دکن پریس؛جولائی ۱۹۰۲ء؛ص:۱
٧۔ عبد السلام خورشید' ڈاکٹر؛"کاروانِ صحافت"؛ص:۱۲۴
٨۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛"ظفر علی خان۔ ادیب و شاعر"؛ص:۳۰٦
٩۔ "دکن ریویو"؛جنوری ۱۹۰۴ء؛ص:۱
١٠۔ ایضاً
١١۔ دکن ریویو، ایڈیٹوریل: شمارہ جنوری ۱۹۰۸ء؛ص:۱
١٢۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛"ظفر علی خان: حیات۔ خدمات۔ آثار"؛ص:۵٧
١٣۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛"ظفر علی خان۔ ادیب و شاعر"؛ص:٧٠
١٤۔ ظفر علی خان، اخبار "زمیندار"، بحوالہ "عبد السلام خورشید' ڈاکٹر؛کاروانِ صحافت"؛ص:۱۳۰
١٥۔ "دکن ریویو"؛شمارہ: جنوری ۱۹۰۸ء
١٦۔ عبد السلام خورشید' ڈاکٹر؛"کاروانِ صحافت"؛ص:۱۳۳
١٧۔ ابو الکلام آزاد؛"الہلال"؛کلکتہ؛۲۱ جنوری ۱۹۱۴ء
١٨۔ شورش کاشمیری؛"ظفر علی خان"؛ص:۹٦
١٩۔ تاجور نجیب آبادی، ماہنامہ: "شاہکار"؛لاہور؛اپریل ۱۹۳۵ء
٢٠۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛"ظفر علی خان: حیات۔ خدمات و آثار"؛ص:۸٧
٢١۔ ایضاً، ص:۱۲۲
٢٢۔ ایضاً، ص:۱۲۵
٢٣۔ عبد السلام خورشید' ڈاکٹر؛" کاروانِ صحافت"؛ص:۱۳٧
٢٤۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛"ظفر علی خان: حیات۔ خدمات و آثار"؛ص:۱۲۹
٢٥۔ ظفر علی خان' مولانا؛"شریعت اور طریقت کی آویزش: مشمولہ: نگارستان"؛لاہور' ظفر علی خان ٹرسٹ؛۲۰۱۰؛ ص:۳
٢٦۔ ظفر علی خان' مولانا؛"اداریہ: روزنامہ زمیندار"؛لاہور: ۲۵ جون ۱۹۲۰ء